



متفرقات

مفتی منیب الرحمن

ہمارے کرم فرما مختلف مزاج کے حامل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سیاست پر لکھنے والے بہت ہیں، بلکہ بدبھمی ہو رہی ہے، جب کہ لکھنے والے اس یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ سارے انقلابات عالم ان کی نوک قلم کے مرہون منت ہیں یا ان کے جوہر دانش سے کشید کیے جاتے ہیں، وہ رکیں تو کائنات کی نبض رک جائے۔ اس کے برعکس بعض دیگر کرم فرماؤں کا اصرار ہے کہ سیاست پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کریں تاکہ متبادل بیانیہ بھی سامنے آتا رہے۔ اسی سبب سے گزشتہ چند کالم عام روش سے ہٹ کر لکھے، کچھ اسفار کا بیان ہو گیا۔ آج منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چند متفرقات پر گفتگو کرتے ہیں۔

امریکی صدارتی انتخاب: 26 اکتوبر تا 12 نومبر بیرون ملک سفر پر رہا۔ اس دوران امریکی صدارتی انتخاب کی مہم عروج پر تھی، اس لیے احباب کی محفل میں یہ موضوع ناگزیر طور پر زیر بحث آ جاتا تھا۔ میں انہیں کہتا کہ آزادی نسواں اور مردوزن کی مساوات کے تمام تر دعوؤں کے باوجود اہل امریکہ نے اپنی دو سو چالیس سالہ تاریخ میں ایک بار بھی عورت کو صدر منتخب کرنے کا تجربہ نہیں کیا یا یوں کہیے کہ خطرہ مول نہیں لیا۔ سو میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ اس بار بھی یہ روایت نہیں توڑیں گے، کیونکہ امریکی صدر کو عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا ہوتا ہے اور تاحال اس کی تمام تر داخلی کمزوریوں، بین الاقوامی توازن تجارت میں منفی اشاریوں (Indicators) کے باوجود کوئی بڑا چیلنج اس کے سامنے نہیں ہے۔ یورپ، جاپان، جنوبی کوریا اور سنگا پور وغیرہ اس سے بغاوت پر آمادہ نہیں ہیں۔ روس ولادیمیر پیوٹن کے زیر قیادت عالمی سیاست میں اپنا ماضی کا سوویت یونین والا مقام حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، لیکن معاشی عدم استحکام و کرپشن کے سبب اور اعلیٰ معیار کی سپر ٹیکنالوجی کے بغیر اس منزل کا حصول اتنا آسان نہیں ہے۔ شاید اس کے لیے اسے ایک عرصے تک انتظار کرنا پڑے گا، سوائے اس کے کہ امریکا خود اپنے داخلی اسباب کی وجہ سے افتراق و انتشار اور ضعف و اضمحلال سے دوچار ہو جائے۔

چین کے لیے بھی دور کا وٹیں ہیں، ایک جدید ترین حساس اور سپر ٹیکنالوجی میں امریکہ کا ہمسرنہ ہونا اور دوسری یہ کہ اس کی معیشت کا انحصار امریکہ اور اہل مغرب پر ہے، کیونکہ مغرب کی مارکیٹیں اور ویر ہاؤسز اس کے سامان ضرورت، آسائش اور تفریح سے بھرے پڑے ہیں۔ امریکہ بھارت کے ذریعے اس کے لیے تحدید و توازن کا سامان کر رہا ہے اور بحر چین پر اس کی اجارہ داری کی راہ میں رکاوٹیں بھی کھڑی کر رہا ہے۔ دوسری جانب بحیرہ عرب کی بالادست فوجی قوت بننے میں وہ بھارت کی ہر ممکن مدد کر رہا ہے، جو ہمارے لیے الارمنگ ہے۔ افغانستان، ایران اور مشرق وسطیٰ کے ممالک سے ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہیں ہیں اور دنیا کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہماری داخلہ و خارجہ پالیسی کی سمت اور ترجیحات کون طے کر رہا ہے۔ 2008ء سے سیاسی حکومتیں نظام اختیارات میں سٹی اور سٹی ہوئی چل رہی ہیں، ایک افتاد ختم نہیں ہوتی کہ کوئی نئی افتاد ان کے استقبال کے لیے تیار ہوتی ہے۔ پھر ہمارا ”مُحِبُّ وطن“ میڈیا ایسا سا باندھتا ہے گویا آج گئے کہ کل

گئے۔ اس پر مستزاد پس پردہ کارفرما کا ہنوں کی جانب سے اُن پر غیبی خبروں کا نزول ہوتا رہتا ہے اور ان کا کام کمال اعتماد کے ساتھ نیا نازل شدہ ہینڈ آؤٹ سنانا ہوتا ہے۔

صدارتی انتخاب میں ڈونلڈ ٹرمپ نے بظاہر غیر سنجیدہ بن کر سفید فام اکثریت کے ذہنوں میں مستقبل قریب یا بعید میں اقلیت میں تبدیل ہونے کا نفسیاتی خوف پیدا کیا، وہ یہ تاثر دینے میں کامیاب رہے کہ تارکین وطن اور اسٹینش لوگ، جنہیں میکسیکن بھی کہتے ہیں، ان کے روزگار پر قابض ہو رہے ہیں، الغرض اس خوف کو بڑھا چڑھا کر انہوں نے اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ وہ اس حکمت عملی میں کامیاب رہے اور عوامی مقبولیت میں ہیلیری کلنٹن کی لاکھوں ووٹوں کی برتری کے باوجود وہ الیکٹرول ووٹ کے بل پر واضح اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ لوگوں کو خدشات تو یقیناً بہت ہیں اور خود امریکہ میں عوامی مظاہرے اس کا واضح ثبوت ہیں، لیکن غالب امکان یہ ہے کہ کانگریس اور اسٹبلشمنٹ کے ساتھ انہیں مل کر چلنا ہوگا اور مکمل نہیں تو مناسب حد تک انہیں توازن قائم رکھنا پڑے گا۔ وہ یقیناً اپنے انتخابی منشور پر بھی کسی حد تک عمل کرنے کی کوشش کریں گے، مگر شاید اس حد تک نہیں کہ امریکی معاشرہ ایک بڑی شکست و ریخت سے دوچار ہو جائے۔

”ماورائے بحر الکابل شراکت داری (TPP)“ کو انہوں نے اپنی صدارت کے پہلے دن ہی ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے، یعنی ”امریکی مفاد سب پر مقدم“ اصل الاصول قرار پائے گا اور اسی بنا پر انہوں نے ماحول کی آلودگی کے بارے میں عالمی کوششوں کا ساتھ دینے کی بجائے کوئلے اور سستے ایندھن سے بجلی گھر اور صنعتیں لگانے کا اعلان کیا ہے، الغرض ٹرمپ اپنے قومی مفاد کی قیمت پر بقیہ دنیا کا روگ پالنے کے روادار نہیں ہیں۔ اس سے پہلے صدر اوباما اپنے ایک ”اسٹیٹ آف دیونین ایڈریس“ میں کہہ چکے تھے: ”ہمیں صنعت کو واپس لانا ہوگا“، لیکن وہ بے اثر ہونے کے سبب اپنی پالیسیوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ کافی عرصے بعد ریپبلکن پارٹی کو کانگریس کے دونوں ایوانوں اور وائٹ ہاؤس پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا ہے، سواب ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور بہر حال انہیں کچھ کر کے دکھانا ہوگا۔ باراک اوباما ایک ناکام صدر ثابت ہوئے، کمزور طبقات کو وہ اپنے وعدوں کے باوجود مناسب ریلیف نہ دے سکے اور تارکین وطن کو قانونی حیثیت دینے کا وعدہ بھی پورا نہ کر پائے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ کانگریس پر ریپبلکن پارٹی کا غلبہ تھا اور انہوں نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے یا شاید ایک سیاہ فام صدر کو انہوں نے دل سے قبول نہ کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی میں ارتعاش: پاکستان پیپلز پارٹی نے سنٹرل پنجاب میں قیادت تبدیل کر دی ہے اور عربی زبان کے قمر اور پنجابی زبان کے چن کا حسین امتزاج ہو گیا ہے۔ یہ دونوں حضرات ہمارے سیاسی اثاثے میں قدرے سلجھے ہوئے لوگ ہیں، دونوں متانت سے بات کرتے ہیں اور لب و لہجہ بھی شریفانہ ہے۔ اخلاق و کردار اور روایات کے اعتبار سے تنزل کے اس دور میں بڑی سیاسی جماعتوں میں چند شرفاء کا وجود بھی غنیمت ہے۔

ہماری سیاست کا المیہ یہ ہے کہ یہ گزشتہ کافی عرصے سے منفی نعروں پر پروان چڑھ رہی ہے، چنانچہ بلاول بھٹو زرداری کو ستر کی دہائی کے ذہلی ہوئی عمر کے انگلو چٹکلے، لطیفے بازیاں، جگت بازی اور اپنے سیاسی مخالفین پر طنز و تعریض کے نشتر چلانا سکھا رہے ہیں۔ سیاست میں جناب عمران خان نے اپنے سیاسی مخالفین کے لیے جو طرز متخاطب متعارف کرایا تھا، وہ اب خود اُن پر بیک فائر ہو رہا ہے۔ مسائل پر مبنی سیاست ہمارا شعار نہیں بن پارہی، یعنی یہ کہ عوامی مسائل کے حل کے لیے محض تخیلاتی نہیں بلکہ دستیاب وسائل کے اندر حقیقت پسندانہ متبادل حکمت عملی پیش کی جائے۔ پاکستان کی سیاست میں جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم اپنا منشور متنازع ہونے کے باوجود ایک نیا ویرن لے کر



آئے، انہوں نے نئے نعرے دیئے، عوام میں اپنے حقوق کے بارے میں آگہی پیدا کی اور ایک نیا شعور دیا، بلکہ ان کے اندر امید کی ایک نئی شمع روشن کی، ایک نئی جوت جگائی۔ پھر اس پر عمل کرتے ہوئے بعض بڑی صنعتوں، بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور تعلیمی اداروں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اس کی قیمت ملک نے صنعتی اعتبار سے ترقی معکوس، تعلیمی معیار کے زوال اور اداروں کی بربادی کی صورت میں چکانی۔ مگر اب فکری تنزل کا عالم یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنما تعلیم تو آکسفورڈ اور کمبریج یونیورسٹی میں حاصل کرتے ہیں، مگر قوم کو درپیش مسائل کے لیے کوئی نئی آدرش، نیا ویژن، نئی حقیقت پسندانہ حکمت عملی دینے کی بجائے ستر کے عشرے کے متروک نعرے دہرانے لگ جاتے ہیں، جو موجودہ دور میں غیر متعلق اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ جنرل 1970 اور اس کے بعد پروان چڑھی، اس کے لیے یہ سب کچھ غیر متعلق ہے، اس لیے ہمیں قومی مسائل کے حل پر مبنی سیاسی منشور اور سنجیدہ حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ بعض اہل دانش کہتے ہیں کہ بلاول بھٹو اپنے والد کے آسیب سے نکل آئیں، یہ خواہش خوبصورت ہونے کے باوجود حقیقت پسندانہ نہیں ہے، وہ زرداری صاحب کا واحد اثاثہ ہیں، انہیں وہ حالات کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ بھٹو خاندان کی تاریخ اُلٹیوں سے بھری پڑی ہے۔

صحافتی اقدار: ہم پیشہ ورانہ اقدار سے محروم صحافتی دور سے گزر رہے ہیں، بے سرو پا دعوے، خود ہی مدعی اور خود ہی منصف بن کر فیصلے صادر کرنا ہماری صحافت کے شہسواروں کا شعار بن گیا ہے۔ کل کی بات جھوٹ بھی ثابت ہو جائے، اگلے دن تازہ غازہ مل کر اور بن سنور کر اس انداز سے بیٹھیں گے کہ جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ دھڑلے سے کہیں گے کہ فلاں بھاگ گیا ہے، اب وہ کبھی نہیں آئے گا اور اگلے دن وہ کہہ دے: ”میں آ گیا ہوں، تیرا کیا بنے گا کالیا“، تو اس پر نہ کوئی جھینپ محسوس کرے گا، نہ شرمساری، نہ اعتذار، اسی کو بے حیائی اور ڈھٹائی کہتے ہیں۔ مگر ہماری موجودہ صحافت کا موٹو یہ ہے: ”اس یقین کے ساتھ جھوٹ بولو کہ مخاطب اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جائے“، اگرچہ اس سچ کی حیات مستعار ایک دن کی ہو۔

اس موضوع کا خیال میرے ذہن میں اس لیے آیا کہ امریکی میڈیا صدارتی انتخاب کی بابت اپنے مختلف تجزیوں اور جائزوں میں ہیلیری کلنٹن کی برتری دکھاتا رہا، مگر حقیقی نتائج اس کے بالکل برعکس آئے۔ سو معتبر امریکی اخبار ”نیویارک ٹائمز“ نے اعتذار نامہ شائع کر کے اپنے قارئین سے معذرت کی کہ وہ صحیح جائزے پیش کرنے میں ناکام رہے اور اپنے قارئین کو انتخابی امیدواروں کی مقبولیت کی صحیح تصویر پیش نہ کر سکے۔ ہیلیری کلنٹن کی برتری کی پیش گوئیوں کے باوجود ڈونلڈ ٹرمپ الیکٹرول کالج میں واضح برتری حاصل کر کے کامیاب ہوئے۔ ادارے نے کسی جیل و حجت اور تاویل کا سہارا نہیں لیا، کیونکہ ان کے لیے سب سے مقدم اپنے اخبار کی ساکھ اور اعتبار ہے، ہمارے ہاں ایسی روایت مفقود ہے اور ایسا شعار موجود ہی نہیں۔ بعض ماہرین نے یہ تاویل کی ہے کہ سفید فام اکثریت نے اپنی رائے کو سروے کے دوران پوشیدہ رکھا اور دل کی بات نہیں بتائی۔ میں پہلے بھی لکھا چکا ہوں کہ یہ سوچ سفید فام اکثریت کے ذہنوں میں یورپ میں بھی موجود ہے، یہ الگ بات ہے کہ کہیں اس کا اظہار ہو جاتا ہے اور کہیں اس کی لہریں زیر سطح گردش کر رہی ہیں۔ امریکہ درحقیقت تاریکین وطن ہی کا ملک ہے، سفید فام لوگ خود یورپ کے مختلف ممالک سے ترک وطن کر کے بہتر مواقع کی تلاش میں امریکہ گئے ہیں۔ یہی صورت حال کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی ہے، اسی طرح مارشس ہندوستانی تاریکین وطن کا ملک ہے۔